بنیادِ زبان

جو باتیں انسان کو دوسرے جانداروں سے مشخص کرتی ہیں ان میں خیال کی ترسیل کے لئے زبان کا استعمال پیش پیش ہے- چنانچہ انسان کی زندگی میں زبان سے زیادہ اہم شاید اور کوئی چیز نہیں ہوگی - اسی سے اسکی قوت ، اسکی صلاحیتیں ، اسکی شناخت اور اسکی بقا متعلق ہے- آج دنیا میں تین ہزار سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن کئی زبانوں میں لکھت کا سسٹم ایجاد نہیں ہوا اور ان زبانوں کا ادب محض بول چال کے لوک ورثہ پر مبنی ہے- یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کے مختلف حصوں میں بولی جانے والی کئی چھوٹی بڑی زبانیں تیزی سے ختم ہورہی ہیں- اسکی کئی وجوہات ہیں جن میں سیاسی اور جغرافیائی نقشوں کی تبدیلی ، بڑے پیمانے پر ترکِ وطن اور مہاجرت ، نیشنلزم کی تحریکیں جو سرکاری زبانوں کو دوسری محلی زبانوں کے مقابلے میں ترجیح دیتی ہیں ، اور انگریزی کا تیزی سے بین الاقوامی زبان بن کر تعلیمی اور کام کاج کے اداروں میں نفوذ کرنا وغیرہ شامل ہے- اسکے علاوہ میڈیا یعنی اخبارات ، ریڈیو ، ٹیلی وژن اور رسائل وغیرہ کے ذریعہ گھروں میں انگلش یا کسی اور یوروپین زبان کا استعمال ایسی نسلوں کو ایجاد کررہا ہے جو اپنی اقلیتی گھریلو زبان کے استعمال سے دور ہوتی جارہی ہیں- برِّصغیر سے اٹھ کر امریکہ اور یوروپ میں آ کر بسنے والے مہاجر لوگوں کی تعداد میں بیسویں صدی کے آخری پچاس سالوں میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے- صرف انگلستان میں بسنے والے ہندوستانی اور پاکستانی لوگوں کی تعداد ساڑھے تین ملین سے متجاوز ہے جبکہ تمام یوروپ اور امریکہ کو اس سلسلے میں شامل کیا جائے تو صرف برّصغیر کے مہاجروں کی تعداد شاید دس ملین تک جا پہنچے گی- ان میں ہندو، سکھ، مسلمان اور دوسرے مذہبی گروہ کے لوگ شامل ہیں ، اور اگرچہ یہ سب مختلف معاشی اور تعلیمی سطحوں پر مختلف انداز سے کامیاب یا ناکام ہیں ، ان میں ایک چیز جو مشترک ہے وہ انکی اولادوں کا اپنی مادری زبانوں سے بتدریج دور ہونے کا مسئلہ ہے- بچے چاہے وہ کسی ہندوستانی ڈاکٹر یا کنسلٹنٹ کے ہوں جو کیلیفورنیا میں سکونت رکھتے ہوں یا کسی پنجابی یا بنگلہ دیشی بے روزگار کے ہوں جو لندن یا مینچسٹر کے اندرونی محلوں میں رہائش پذیر ہوں ، ان سب کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ انگریزی کے غلبہ کے باعث اپنی گھریلو زبان کے روزمرہ استعمال سے دور ہوتے جارہے ہیں-

پھر یہ بات کوئی برِّصغیر کے مہاجروں ہی سے مخصوص نہیں ہے ، بلکہ دیرپا مہاجرت ، چاہے وہ آج عمل میں آئی ہو یا صدیوں بلکہ ہزاروں سال پہلے ظہور پذیر ہوئی ہو ہمیشہ بہت کچھ کھو کر حاصل ہوتی ہے جس میں زبان کا مسئلہ پیش پیش رہتا ہے- مہاجرتیں جب جغرافیائی علاقوں کو پھلانگ کر عمل میں آئیں جیسے کوئی صرف چوبیس گھنٹے کے سفر میں ایشیا سے اٹھ کر یوروپ یا امریکہ تک پہنچ جائے تو آنے والی نسلوں پر اس منتقلی کا اثر جھٹکے دار اور فوری ہوتا ہے ، لیکن اگر مہاجرتیں متصل جغرافیائی علاقوں کے درمیان عمل میں آئیں تو زبان میں تبدیلی نہ صرف بتدریج عمل میں آتی ہے بلکہ یہ عمل بجائے خود انسان کے لسانی ذخیرہ اور تجربہ میں خاطر خواہ اضافہ کرتا ہے اور مہاجر زبان میں محلی اثرات کی بنا پر اضافے اور تبدیلیاں ہونے لگتی ہیں- جب کوئی زبان کسی وسیع جغرافیائی علاقے میں پھیل جائے تو اس میں ہونے والی محلی اور مقامی تبدیلیوں سے مختلف لہجوں یعنی dialects کا اضافہ ہونے لگتا ہے جیسے مثلاً عربی کیساتھ ہوا - اسلام کے نفوذ کے بعد عربی مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں تیزی سے پھیلی اور چند صدیوں بعد اسکے استعمال اور مقامی رواج میں تبدیلیوں نے اسکو کئی dialects عطا کئے جو اب اکثراً آپس میں انکے بولنے والوں کے لئے قابلِ فہم نہیں ہیں- مثلاً اگرچہ تمام عرب ممالک معیاری یا لکھت کی عربی کے ذریعہ آپس میں لسانی طور پر منسلک ہیں ، لیکن مختلف جغرافیائی علاقوں میں بول چال کی عربی کے ضمنی لہجے ایک دوسرے سے مختلف ہوگئے ہیں- بعض اوقات یہ ضمنی تبدیلیاں اسقدر وسیع پیمانے پر ہوتی ہیں کہ ایک ہی زبان کے دو لہجے ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی ہوجاتے ہیں اور اسطرح نئی زبانوں کا وجود عمل میں آنے لگتا ہے-

الغرض ماضی میں زبانوں کی جغرافیائی توسیع قافلوں کی صدیوں پر محیط آہستہ خرام مہاجرت کے زیرِ اثر عمل میں آئی ہے- اور اکثر اوقات زبان میں اضافے اور تبدیلیاں ان معنوں میں مثبت رہی ہیں کہ اسکے بولنے والوں کو ان تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ خود ثقافتی طور پر بتدریج بدلنے کا موقع ملتا رہا ہے- اسکی سب سے بہترین اور مثبت مثال اردو کے ارتقا کی ہے- عربستان ، ایران ، ترکی اور افغانستان سے ہندوستان آنے والے قافلے چاہے وہ فوجی نوعیت کے تھے یا محض تجارتی اور مہاجرتی ، اپنے ساتھ اپنی زبانیں اور رسم و ریت لے کر آئے اور شمالی ہند کی انڈو آریائی زبانوں سے عمل ردِّعمل کے باعث صدیوں میں جا کر ایک مخلوط زبان اردو کے خالق بن گئے- اس اختلاط و باہمی لسانی ازدواج نے اسکے بولنے والوں کو لسانی تسلسل و بتدریج تبدل کا بیش بہا تحفہ دیا- یعنی اردو کے ارتقا میں فارسی، ترکی ، عربی اور دوسری محلی زبانوں کے الفاظ اور اصطلاحیں اسطرح شامل ہوتے چلے گئے کہ فارسی اور ترکی بولنے والوں کو اپنی مادری زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کو اپنانے کا بتدریج موقع ملتا رہا- اسکے علاوہ اردو کی لکھت کے لئے فارسی رسم الخط کا استعمال بھی فارسی اور ترکی بولنے والوں کے لئے ایک سہولت کا باعث رہا جس نے اردو

کی ترویج اور اسکے ارتقا میں بڑی مدد دی - یہ سب اس وجہ سے ہوا کہ شمالی ہند کا علاقہ جغرافیائی طور پر افغانستان، ایران اور ترکستان سے جڑا ہوا تھا اور یہی وجہ ہے کہ آج آٹھ سو سال گذر جانے کے بعد بھی، اگرچہ کہ ہم فارسی اور ترکی یا عربی نہیں بولتے، لیکن ان زبانوں سے ہمارا لسانی ربط برقرار ہے- اس تسلسل نے ہم کو ہماری تاریخی ادبی اور ثقافتی یادیں برقرار رکھنے کا موقع دیا اور ہماری گروہی، لسانی اور ثقافتی شناخت باوجود صدیاں گزر جانے کے آج بھی قائم ہے- ہماری اس شناخت کی جڑیں مشرقِ وسطیٰ کی زرخیز مٹی میں پیوست ہیں-

چنانچہ زبانوں میں بتدریج تبدیلی برحق ہے اور انکی کسی 'خالص' حالت میں برقراری کے سلسلے میں اولاد پر جبر وتشدد جائز قرار نہیں دیا جاسکتا ، لیکن اسکے ساتھ ہی ساتھ والدین کا اس سلسلہ میں تردد اور اندیشہ اور انکی یہ خواہش کہ انکا ثقافتی اور لسانی ورثہ انکی اولاد میں منتقل ہو، بڑی حد تک قابلِ فہم ہے- بات دراصل یہ ہے کہ جب تبدیلی اچانک آئے تو اپنے ساتھ تخریب کا عنصر لاتی ہے- اب ہجرتیں اچانک عمل میں آتی ہیں اور مہاجروں کی والدین نسلیں تلاشِ روزگار و معاش میں مصروف و مبتلا ہوکر اکثر اپنے بچوں کے لسانی اور ثقافتی کردار کی کامیاب صورتگری کرنے سے قاصر رہتی ہیں- نوجوان نسلوں کا اپنے اطراف و اکناف کے ماحول اور اسکے اثرات کو قبول کرنا ایک فطری عمل ہے، لیکن اگر ان میں جاگزیں ہونے والی لسانی تبدیلی اپنی مادری زبان کی قیمت چکا کر قبول کی جارہی ہے تو یہ ایک قابلِ تردد بات ہے- انگریزی کا استعمال اب تعلیمی میدان میں ناقابل انکار ہوگیا ہے اور اگر ہم ہندوستان کی مثال سامنے رکھیں تو آج سے نہیں بلکہ اسوقت سے جب برطانوی راج کے دور میں ہندوستانیوں نے اس زبان میں تھوڑی بہت دسترس حاصل کر کے سرکاری اداروں میں اپنا کلرک طبقہ آباد کیا تھا اور جہاں مشن اسکول اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ انگریزی کسی طرح محلی زبانوں کی جگہ لے لے- قومی سیاسی تحریکوں کے زور پکڑنے کے بعد مختلف خطوں میں مختلف ریاستی حکومتوں نے اپنی مقامی زبانوں کو قائم رکھنے کے لئے تعلیمی اور سرکاری اداروں میں ان کا چلن کیا تھا - اسکے باوجود اس سلسلے میں انکی کامیابی محدود رہی- ریاستِ حیدرآباد میں بیسویں صدی کے اوائل میں ادارہء دارالترجمہ کے قیام کے دوران اگرچہ اردو زبان کے لئے بیش بہا تعلیمی اور علمی خزینہ جمع کیا گیا لیکن بہرحال یہ سلسلہ اس لئے کامیاب و دیرپا نہیں ہوسکا کہ علم کے میدان میں روزانہ اضافے انگریزی زبان کے ذریعے عمل میں آرہے تھے اور آج بھی آرہے ہیں اور کسی بھی قومی یا محلی زبان میں تعلیمی اغراض کے لئے انگریزی سے پیہم ترجمے بین الاقوامی علمی تبدیلیوں کے ساتھ شانہ بہ شانہ نہیں چل سکتے سوائے اسکے کہ ایک وسیع وعریض مترجم نظام اس ہی کام کی سربراہی کے لئے وجود میں لایا جائے جسکے مالی اور فنی وسائل لامحدود ہوں- یہاں ہم اگرچہ روس، جاپان اور چین کی مثال دے سکتے ہیں جہاں انکی قومی زبانیں تعلیمی اور صنعتی میدان میں دنیا کے شانہ بہ شانہ چل رہی ہیں لیکن یہاں بھی انگریزی بحیثیت زبانِ دوم کے اہمیت اختیار کرتی چلی جارہی ہے اور کمپیوٹر کے ذریعہ بین الاقوامی انٹرنیٹ رابطہ بھی زیادہ تر انگریزی میں ہوتا ہے- یہی حال یوروپ کے اکثر ممالک میں ہے- لہٰذا انگریزی کے نفوذ سے اگرچہ انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ مہاجر نسلوں کے لئے زبانِ دوم سے تجاوز کر کے زبانِ واحد کا درجہ نہ اختیار کرلے-

جب کوئی لسانی گروہ کسی غالب زبان کو ماحول کے زیر اثر اسطرح قبول کرتا ہے کہ اسکی بول چال اور اسکے اظہار کی عادت میں وہ فطرتِ ثانیہ بن جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ غلبہ پرور زبان اس گروہ کے لئے ترجیحی زبان کا درجہ اختیار کرگئی - مثلاً اگر نسلِ دوم میں مہاجر بچے عادتاً آپس میں صرف انگریزی میں بات کریں تو اگرچہ انگریزی انکی مادری زبان تو نہیں بنی لیکن وہ انکے روزمرہ استعمال اور اظہار کیلئے ترجیحی ذریعہ بن گئی - یہ عمل انکو انکی مادری یا گھریلو زبان سے بتدریج دور کر کے اس زبان میں انکی قوتِ اظہار کو آہستہ آہستہ تقریباً ختم کر دیتا ہے- برطانیہ اور امریکہ میں پلنے بڑھنے والے مہاجر بچے اب زیادہ تر وہ ہیں جنکے لئے انگریزی ایک ترجیحی زبان یعنی preferred language بن گئی ہے اور یہ عمل انکو بتدریج bilingual سے monolingual بنا رہا ہے، جو ایک افسوسناک بات ہے- اس مضمون کو زیرِ قلم لانے میں یہی تردد باعثِ تحریر ہوا ہے- جب تک مہاجر نسلوں کے والدین ان عوامل پر غور نہیں کریں گے جو زبانوں کے ارتقا اور انکی بقا کے سلسلے میں اہمیت رکھتے ہیں اسوقت تک یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ آنے والی نسلوں کے لئے اپنی زبانوں کو برقرار رکھ سکیں گے-

زبان کے استعمال میں چار صلاحیتیں کارفرما ہوتی ہیں، یعنی سننا، بولنا، لکھنا اور پڑھنا - کوئی بھی ان چار صلاحیتوں پر یکساں حاوی نہیں ہوتا - اسکے علاوہ سن کر سمجھنے کی صلاحیت ہمیشہ بولنے کی صلاحیت سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے- مثلاً ہم کسی بھی موضوع پر کسی کی تقریر کو پورا پورا سمجھ سکتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ اس موضوع پر ہم اسی روانی اور دسترس سے بول بھی سکیں- اسی طرح ہم اگر کسی زبان میں لکھنا پڑھنا جانتے ہیں تو ہماری پڑھنے کی صلاحیت لکھنے کی صلاحیت سے ہمیشہ زیادہ ہوگی - مہاجر بچوں کی نسلِ دوم میں اکثر مادری زبان میں کوئی بات سن کر اسکو سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے لیکن وہ خود اس زبان کو برائے اظہار استعمال کرنے سے گریز کرنے لگتے ہیں - اسکے علاوہ اگر انکو اپنی زبان کی لکھت نہیں سکھائی جاتی تو انکا لسانی تجربہ صرف سننے اور شاذ و نادر بولنے پر محدود ہوکر رہ جاتا ہے اور انکی لغات اسقدر محدود ہوجاتی ہے کہ وہ بسا اوقات سن کر سمجھنے میں بھی تکلف محسوس کرنے لگتے ہیں- لکھنے پڑھنے کی صلاحیت کے بھی درجے ہوتے ہیں- جس زبان میں بچے کہانی کی

کتابوں کے شوقین ہوجاتے ہیں انکی سن کر سمجھنے اور بولنے کی صلاحیتیں بڑی حدتک محفوظ ہوجاتی ہیں اور جب بچے کہانی کی کتابوں سے تجاوز کرکے سنجیدہ ادب کو پڑھنے اور سمجھنے کے نہ صرف قابل ہوجاتے ہیں بلکہ اسکے عادی ہوجاتے ہیں تو اس صورت میں انکی مادری زبان انکے لئے محفوظ ہوجاتی ہے اور وہ اس مہاجر معاشرے کے افراد بن جاتے ہیں جو زبانِ غالب کے ماحول میں اپنی لسانی اور ثقافتی شناخت کو برقرار رکھنے میں بڑی حدتک کامیاب ہوچکا ہے-

جو افراد کامیابی سے دو زبانوں کا استعمال کرلیتے ہیں وہ ذواللسان کہلاتے ہیں- ذولسانیت یعنی bilingualism کی کئی اقسام ہیں جن میں subtractive bilingualism یعنی منفی ذولسانیت کی مثال یوں ہے کہ استعمال کنندہ ہر دو زبانوں کے استعمال پر صحیح قدرت نہیں رکھتا اور جہاں اسکی ایک زبان کی صلاحیت اسکی دوسری زبان کی صلاحیت میں اسطرح حارج ہونے لگتی ہے کہ وہ بتدریج اپنی مادری یا گھریلو زبان کی بھرپور صلاحیت کو ہاتھ سے کھونے لگتا ہے- اکثر وبیشتر ذواللسان افراد اگر دونوں زبانوں میں بول چال کی صلاحیت رکھتے ہوں تو وہ گفتگو کے درمیان ایک زبان استعمال کرتے وقت دوسری زبان سے الفاظ اور بعض اوقات جملے مستعار لینے لگتے ہیں- یہ ذواللسانیت کی عام کیفیت ہے لیکن اس طرح ایک زبان سے دوسری زبان میں الفاظ یا جملے مستعار لینے میں دو قسم کے عمل دیکھنے میں آتے ہیں، ایک جس کو code-switching کہتے ہیں اور دوسرا وہ عمل جسکو code-mixing کہتے ہیں- کوڈ سوئچنگ میں بولنے والا کبھی ایک زبان استعمال کرتا ہے اور کبھی دوسری اور اس سلسلے میں غیر شعوری یا نیم شعوری فیصلے وہ اپنی سہولت کے لحاظ سے کرتا چلا جاتا ہے، یعنی یہ کہ کسی مخصوص موضوع یا مطلب کے اظہار میں اسکو زبان نمبر ا سے زیادہ سہولت زبان نمبر ۲ میں ہونے لگتی ہے اور مضمون کے بدل جانے کے بعد وہ پھر زبان نمبر ا میں واپس آجاتا ہے- بسا اوقات وہ سہولت کی خاطر نہیں بلکہ سماجی ضروریات کے تحت ایسا کرتا ہے یا پھر سننے والے کی لسانی صلاحیت میں کمی بیشی یا اس کا سماجی پسِ منظر بولنے والے کی بول چال کے طرزِ عمل پر اور الفاظ اور زبان کے چناؤ کے عمل پر اثر انداز ہونے لگتا ہے- انگریزی کے استعمال کے سلسلے میں یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کچھ لوگ اپنی لیاقت کے اظہار کے لئے بھی خواہ مخواہ انگریزی بولنے لگتے ہیں- انگریزی کے ساتھ یہ رویہ صرف برِّصغیر کے افراد پر ہی نہیں محدود بلکہ ترقی پذیر ممالک میں جہاں جہاں انگریزی کا جاننا معاشی اور تعلیمی ضروریات کے لئے لازم ہو، وہاں انگریزی کو ایک elitist زبان کا درجہ حاصل ہوجاتا ہے- انگریزی یا کسی اور یوروپین زبان کے استعمال پر فخر دنیا کے اکثر حصوں میں نوآبادیاتی نظام کی حالیہ تاریخ کی وجہ سے بھی مشاہدے میں آتا ہے- پاکستان اور ہندوستان میں اب ہر 'پڑھا لکھا' شخص اردو بولتے وقت اس میں غیر ضروری انگریزی کے الفاظ یا جملے شامل کرتا چلا جاتا ہے جو اکثر سماعت پر شاق گذرتا ہے- دو زبانوں کے جاننے والے ہر دو زبانوں کے استعمال کا جائز حق رکھتے ہیں بشرطیکہ وہ ان دو زبانوں کو علیحدہ رکھ سکیں اور انکو بیجا خلط ملط نہ کریں- ایسا کرنا اگرچہ آسان نہیں ہے، لیکن اس سلسلے میں میں ہم سب کو کوشش کرنی چاہیے-

کوڈ مِکسنگ code mixing جسکا اوپر ذکر آیا وہ زبان نمبر ا میں گفتگو اور بیان کے دوران ایک ہی جملے میں زبان نمبر ۲ سے الفاظ مستعار لینے کے عمل کا نام ہے- یہ عمل بھی بول چال میں بہت عام نظر آئے گا، اور بعض اوقات ایسا کرنا ناگزیر ہوجاتا ہے، اسلئے کہ بعض الفاظ کا نعم البدل انسان کی مادری زبان میں نہیں ہوتا یا اگر ہوتا ہے تو اسکا ترجمہ بولنے اور سننے والے کے لئے اکثر غیر ضروری تکلف کا باعث ہونے لگتا ہے- لیکن بسا اوقات یہ کوڈ مکسنگ نہایت غیر ضروری ہوتی ہے اور جو الفاظ مثلاً اردو بولتے ہوئے انگریزی سے مستعار لئے جاتے ہیں انکی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہوتی - اس مثال پر غور کیجئے :

آپ بے بی کو لُک آفٹر کرلیجئے تو میں سامنے والی شاپ سے جاکر ذرا امی کے لئے کوئی
ڈیسنٹ سا سویٹر چوُز کرلوں، اَدَروائز پھر یہ کام کل تک کے لئے پوسٹ پون ہوجائے گا-

جن گھرانوں میں اس قبیل کی اردو (یا کوئی بھی اور مادری زبان یا زبانِ دوم) دن رات استعمال ہورہی ہو اور جہاں ماں باپ سے اولاد تک پہنچنے والی زبان کی ان مثالوں کے علاوہ بچے صبح سے شام تک اسکولوں میں اور گھر پر ٹی وی کے ذریعے انگریزی کی مختلف اقسام کے سمندر میں غوطے لگا رہے ہوں وہاں انکا اپنی زبان کی پُراثر صلاحیتوں سے بتدریج دور ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے- چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ گھر پر حتہ الامکان اپنے معاشرے کی زبان بولی جائے اور ٹیلیوژن کے استعمال میں تخفیف کی جائے- اسکے علاوہ بچوں کو شروع ہی سے اپنی زبان کی لکھت سے واقف کروایا جائے تاکہ وہ کتابوں کے ذریعے اپنے ادبی، ثقافتی، لسانی، سیاسی اور تاریخی ورثہ سے واقف ہوتے جائیں- یہی بات انکی گوناگوں ثقافتی اور لسانی شناخت کو برقرار رکھنے کا ذریعہ بنے گی- یوروپ اور امریکہ میں اکثر برِصغیر کے مسلمان مہاجروں نے اس شناخت کو برقرار رکھنے کے سلسلے میں کمیونٹی سینٹرز اور مساجد کا سہارا لیا ہے جہاں مذہب کی تعلیم سے آگے بات نہیں بڑھتی، اور ثقافت یعنی کلچر کا مسئلہ پسِ پشت پڑ جاتا ہے- انسانوں کی کلّی شناخت میں مذہب سے زیادہ انکی زبان کا حصہ ہوتا ہے اسلئے کہ زبان کے وسیع تر متن میں نہ صرف مذہب کا لسانی کردار شامل ہوتا ہے بلکہ اس میں انسان کی سماجی، معاشی، تاریخی، ادبی اور ہنری کاوشوں کے پہلو اجاگر ہوتے ہیں اور اسکی وسیع تر شناخت کے ضامن

ہوتے ہیں- ہندوستان سے آنے والے ہندو اور سکھ اپنی زبانوں کی بقا کے سلسلے میں نسبتاً زیادہ کامیاب ہیں اسلئے کہ انکی مذہبی تقاریب اور رسومات میں موسیقی اور شعر و ادب کے عناصر شامل رہتے ہیں جو زبان کے عمل کو سریع الاثر بناتے ہیں-

جن معاشروں میں زبان کے ان امور کی طرف کوئی باقاعدہ توجہ نہیں ہوتی وہ آہستہ آہستہ اپنی شناخت کھو بیٹھتے ہیں- نو آبادیاتی نظام کے یوروپین اور دوسرے مغربی معاشروں نے جب مفتوح علاقوں کو اپنے قبضے میں کیا تو سب سے پہلے وہاں کے باشندوں کی زبانوں کو مختلف طریقوں سے ختم کیا - افریقہ کے سواحل سے پکڑ کر لائے جانے والے حبشی غلاموں کو اپنی مادری زبان استعمال کرنے پر انکے یورپین اور امریکی مالک سخت سزائیں دیتے تھے، چنانچہ چند نسلوں کے بعد یہ لوگ افریقی زبانیں بھولنے کے باعث اپنی تاریخی اور ثقافتی یادیں اپنی اولاد تک پہنچانے سے قاصر ہو گئے- صرف انگریزی بولنے کی صلاحیت انکے لئے کبھی بھی سماجی مساوات کا ذریعہ نہیں بنی- تیس چالیس سال پہلے برطانیہ کے اسکولوں میں آنے والے ایشین بچوں کے لئے زبان کی جو حکمتِ عملی کارفرما تھی اسکے زیرِ اثر ان بچوں کو کلاس روم یا اسکول کے احاطہ میں اپنی گھریلو زبان کے استعمال سے روکا جاتا تھا اور توقع یہ کی جاتی تھی کہ وہ صرف اور صرف انگریزی کے استعمال کے باعث جلد از جلد انگلستان کے میزبان معاشرے میں ضم ہو جائیں گے- انضمام یعنی assimilation کی اس پالیسی کا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا کہ یہ بچے انگریزی پر حاوی ہو کر تعلیمی میدان میں جلد از جلد گوروں کی طرح کامیاب ہو جائیں، بلکہ یہ کہ اپنی زبان بھول کر وہ اپنی کلچرل شناخت کے فرق کو برقرار رکھنے میں ناکام ہو جائیں اور اس ضمن میں اپنے جائز حقوق کے مطالبات سے میزبان ملک کے لئے زحمت کا باعث نہ بن جائیں- تدریسِ زبان اور لسانیات کے میدان میں برسوں سے ہونے والی مغربی تحقیق اور ریسرچ نے یہ آشکارا کیا ہے کہ جو بچے اپنی مادری زبان کا عمدہ اور مثبت تجربہ رکھتے ہوں ان میں نہ صرف دوسری اور تیسری زبان سیکھنے کی صلاحیتیں بہتر اجاگر ہوتی ہیں بلکہ انکے cognitive development پر یعنی انکی فکری نشو ءنما اور قوت پر بیحد مثبت اثر پڑتا ہے- برطانیہ میں برسوں کی سیاسی جدوجہد کے بعد اب یہ ہوا ہے کہ ثقافتی اور لسانی انضمام کی اس حکمتِ علمی کی جگہ integration یعنی ہم آہنگی کی حکمتِ عملی نے لے لی ہے- میزبان معاشرے کے ساتھ ثقافتی ہم آہنگی میں نہ صرف کوئی ہرج نہیں ہے بلکہ تمام مہاجر معاشروں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ جس ملک اور قوم کے مہمان بن کر آئے ہیں اسکے ساتھ حتہ الامکان ہم آہنگی کے ساتھ رہیں، بشرطیکہ اس سلسلے میں انکو اپنی لسانی شناخت کی قربانی نہ دینا پڑے-

اب چونکہ اردو کا ذکر اس سلسلے میں کئی بار آ چکا ہے اسلئے یہاں یہ ذکر بیجا نہیں ہوگا کہ زبان کی برقراری اور بقا کے سلسلے میں یہ کافی نہیں ہے کہ صرف اسکی معمولی لکھت بچوں کو سکھانے پر اکتفا کیا جائے، بلکہ زبان میں شعر و ادب اور موسیقی کی جڑیں جو پیوست ہیں، ان تک نئی نسلوں کو کم سنی میں بول چال کے ذریعہ اور اسکے علاوہ کہانی کی سینکڑوں کتابوں کے ذریعہ پہنچایا جائے - اردو کے مزاج میں جو چاشنی اور لطافت ہے وہ اسکے شعری اور ہنری ورثہ سے منسلک ہے اور اردو کو اس سے جدا کر کے ہم اردو کی دیرپا بقا کے سلسلے میں کوئی خدمت نہیں کر سکتے - برطانیہ میں مثلاً جو مساجد اور دینی مدارس ہیں وہ اس طرف کبھی توجہ نہیں کریں گے، بلکہ ان کا سارا ایجنڈہ یہی ہے کہ وہ بچوں کو ان 'خرافات' سے دور رکھ کر ان کو 'مثالی' مسلمان بنائیں- زبان اگر صرف درسی کتابوں میں محدود ہو سکتی تو بات بڑی آسان ہو جاتی - اسی طرح بول چال کی زبان کو اگر رٹے ہوئے جملوں کے کوزے میں ہم بند کر سکتے تو ہر وہ بچہ جو کچھ رٹ لیتا وہ ماہرِ زبان ہو جاتا - 14 اگست کو پاکستان کے یومِ آزادی کے موقعے پر پاکستانی کمیونٹی بڑا زور مارتی ہے تو بچوں کو علامہ اقبال اور قائدِ اعظم محمد علی جناح پر لکھی لمبی لمبی تقریریں یاد کروا کر مائک کے سامنے کھڑا کر دیتی ہے- ان تقاریر میں استعمال ہونے والی اردو کا بچوں کی عملی لسانی صلاحیتوں سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا، نہ ہی تقاریر کے لُبِ لُباب میں کوئی دیرپا سیاسی یا سماجی وژن ان بچوں کو آئندہ کے لئے دستیاب ہوتا ہے- سیاسی اور سماجی سمجھ بوجھ کی صلاحیتیں زبان کے تخلیقی اور ثقافتی استعمال میں پیوست ہوتی ہیں- یہ تخلیقی اور ثقافتی استعمال اگر بچے کو گھر یا گھر سے باہر کمیونٹی کے ماحول میں دستیاب نہ ہو تو اسکی نشوء ونما میں اسی طرح فرق آ جاتا ہے جیسے اس پودے کی نشوءنما میں جسکو پانی تو ملا لیکن جسکے بیج اور جڑوں کو کبھی زرخیز کھاد نصیب نہیں ہوئی - جب یہ پودا فطرت کے تقاضے سے بڑا ہوتا ہے تو نہ اسکی شاخوں پر پھول آتا ہے نہ اسکا میوہ کسی کو دستیاب ہوتا ہے- فطرت کے یہ بے ثمر اور بے فیض ٹھنٹ پاکستانی نوجوان کمیونٹی میں چاروں طرف بہ کثرت اُگے نظر آ جائیں گے-

عمدہ زبان کے پھول کامل سکوت اور خاموشی میں کھلتے ہیں- جس ماحول میں شور و غل ہو وہاں نہ زبان ٹھیک سے پنپتی ہے نہ ذہنی صلاحیتیں ہی اجاگر ہوتی ہیں- ان ہر دو چیزوں کے لئے سکوت، سکون اور خاموشی نہایت ضروری ہوتے ہیں- ٹیلیوژن سے اٹھنے والا شور نہ صرف گھر کے لسانی ماحول کے حق میں سمِ قاتل ہوتا ہے بلکہ ہر نوع کا مسلسل بے ہنگم شور بچے کی شخصیت پر بطورِ کلی نہایت مضر اثرات چھوڑتا ہے- بچے کی عمر کے ابتدائی زمانے میں اگر پرسکون ماحول میں اسکو زبان کے عمدہ نمونے دستیاب ہوتے رہیں تو وہ آگے چل کر نہ صرف اپنی زبان کو قائم رکھ سکتا ہے بلکہ وہ دوسری زبانیں سیکھنے کے سلسلے میں دوسروں سے نسبتاً زیادہ کامیاب رہتا ہے- عمدہ اور بھرپور زبان کی صلاحیت تعلیمی میدان میں بچوں کی دیرپا کامیابی کی ضامن ہوتی ہے- چنانچہ زبان کی بقا کا انحصار دراصل گھر کے لسانی ماحول سے منسلک ہے-

جس گھر میں مسلسل مخلوط قسم کی زبان بولی جارہی ہواور جہاں ٹیلیوژن کے ذریعے مسلسل انگریزی کے علاوہ بے ہنگم 'موسیقی' کا شور طاری ہو، جہاں ہر جملے میں دو چار ایسے الفاظ دوسری زبان سے مستعار لئے جارہے ہوں جنکا آسان نعم البدل مادری زبان میں موجود ہے ، وہاں بچوں کا اپنی ابتدائی زندگی میں نیم اللسان یا semi-lingual ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں- اور پھر انکے ماں باپ جو اپنے وطن سے مادری زبان کی اچھی صلاحیتیں ساتھ لائے تھے، وہ خود جب اپنے بچوں تک اپنی زبان کی ترسیل اور منتقلی میں کامیاب نہیں ہوسکے تو انکے بچے جو بات چیت وغیرہ میں محض انگریزی کا استعمال کرتے ہیں اور جو اَب اکثر حالتوں میں اپنی مادری زبان میں لکھنا پڑھنا نہیں جانتے ، ان سے کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ خود اپنی اولاد تک اپنی مادری زبان کو کامیابی سے پہنچاسکیں گے؟ ہماری آنکھوں کے سامنے ہی پچھلے تیس چالیس سالوں میں مہاجروں کی نئی نوجوان نسلیں امریکہ اور یوروپ میں پیدا ہوگئی ہیں جو اپنی زبان کے استعمال سے عملاً دور ہیں-

کچھ گھرانے ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں ماں اور باپ دونوں کی مادری زبانیں مختلف ہوتی ہیں- بہت سے پاکستانیوں اور ہندوستانیوں نے غیر قوموں میں جیسے انگلش یا امریکن عورتوں سے شادی کرلی- ایسی صورت میں زیادہ تر یہ دیکھا گیا ہے کہ بچے صرف انگریزی ہی بولتے ہیں، حالانکہ ہونا یہ چاہئیے کہ انکے بچے ذوالسان ہوں- بین لسانی شادیاں کوئی نئی بات نہیں ہیں اور اس سلسلے میں بھی ہونے والی ریسرچ نے یہ واضح کیا ہے کہ اگر والدین بچوں سے صرف اور صرف اپنی مادری زبان میں بات کریں (یعنی ماں اپنی مادری زبان میں اور باپ اپنی مادری زبان میں) تو اسطرح انکے بچے دونوں زبانیں سیکھتے ہوئے بڑے ہونگے - اس سلسلے میں میرا خود مشاہدہ اپنے بھانجے کے گھرانے کو کیلیفورنیا میں دیکھ کر ہوا- انکی دوسری بیوی ویت نامی ہیں- میرے بھانجے نے میری رائے پر عمل کرتے ہوئے اپنے بچوں سے ہمیشہ اردو میں بات کی جبکہ انکی بیوی بچوں سے ویت نامی زبان میں گفتگو کرتی رہیں- چنانچہ انکی پہلی بچی ثناء شروع ہی سے تین زبانوں میں گھری ہوئی تھی ، ایک تو انگلش جو اسکو اسکول جانے سے پہلے ٹی وی اور اپنے سوتیلے بڑے بھائی سے ملی ، دوسرے اردو جو اسکو اپنے باپ اور دادا، دادی سے ملی اور تیسرے ویت نامی زبان جو اسکو اپنی ماں اور اسکی سہیلیوں اور کام کرنے والیوں سے ملی- ثناء کی زندگی کے شروع کے بیس پچیس مہینے ایک دبدھے میں گذرے، اسلئے کہ اسکو شروع ہی سے تین زبانیں سننے کا تجربہ ہورہا تھا، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ یہ تینوں زبانیں علیٰحدہ علیٰحدہ استعمال ہورہی تھیں ، اور انکے استعمال کرنے والے اپنے معمول سے نہیں ہٹتے تھے ،یعنی مثلاً میں نے یہ نہیں دیکھا کہ باپ نے اپنی بچی سے کبھی انگریزی میں بات کی ہو- چنانچہ اس میں شک نہیں کہ ثناء کی زندگی کے ابتدائی چند مہینے ایک کشمکش میں گذرے جب اسکا ننھا سا ذہن ان تین زبانوں کی صداؤں ، انکی قواعد، انکی لغات اور انکی دوسری علامتوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے میں مصروف رہا ، جبکہ ابتداً وہ ان تینوں کو ایک ہی زبان سمجھتی تھی- لیکن تیس مہینے کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ثناء اس قابل ہوچکی تھی کہ تینوں زبانوں کو نہ صرف علیٰحدہ کرسکے بلکہ انکو موقع کے لحاظ سے الگ الگ اشخاص سے الگ الگ استعمال کرسکے- نہ صرف یہ بلکہ وہ اس چھوٹی سی عمر میں اردو سے ویت نامی اور ویٹ نامی سے اردو یا انگریزی میں حسبِ ضرورت لوگوں کے لئے ترجمے فراہم کرنے لگی تھی- میرے بھانجے کے گھر کے اس کامیاب multi-lingual ماحول کی مثال دیکھنے میں کم آئے گی لیکن زبان کی کامیاب ترویج کے لئے وہ ساری شرائط وہاں موجود تھیں جنکی گود میں ذہانت اور تعلیمی کامیابی جنم لیتی ہے- ثناء اور اسکی دو اور چھوٹی بہنوں کے لئے یہ بات دعویٰ سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ تینوں تعلیمی میدان میں نہ صرف غیر معمولی کامیابی حاصل کریں گی بلکہ انکو اپنی ماں اور اپنے باپ ہر دو کی طرف سے جو سہ لسانی اور multi-dimensional دنیا ورثہ میں ملی ہے اسکی بنا پر وہ اپنی گوناگوں شناخت اور صلاحیتوں کو برقرار رکھنے میں دوسرے عام بچوں کی بہ نسبت بہت زیادہ کامیاب رہیں گی-

چنانچہ اسکول یا ابتدائی مکتب سے پہلے وہ گھر کا ماحول ہوتا ہے جہاں بچوں کی لسانی ،تعلیمی اور ثقافتی شناخت کی بنیاد ڈالی جاتی ہے- اگر گھر کا ماحول زبان کی پرداخت اور اسکی بقا کے سلسلے میں ناکام ہو تو پھر مکتب اور اسکول گویا اس ہاری ہوئی بازی کا پانسہ پلٹنے میں اکثر و بیشتر ناکام رہتے ہیں- گھر کے جس ماحول کا ذکر ہورہا ہے وہاں علاوہ بول چال کی زبان کے صحیح اصولوں کی عمل آوری کے، لکھنے پڑھنے کی صلاحیت کو اجاگر کرنے کا ماحول بھی ہونا چاہئے ،خصوصاً مادری زبان میں- زبانوں کی بقا میں انکی لکھت اور انکے ادب کی بہت اہمیت ہوتی ہے- جن گھرانوں میں کتابوں کا ماحول نہیں ہوتا وہاں سے نکلنے والے بچے ان پتلوں کی طرح ہوتے ہیں جن میں جان صرف آدھی پڑی ہے- اسی طرح زبان کو تقویت پہنچانے والی سرگرمیوں میں موسیقی و ہنر اور سیکولر شعر و ادب کا بہت ہاتھ ہوتا ہے- نثر کی بنیاد کہانیوں سے پڑتی ہے اور نظم کی بنیاد کے لئے لوریاں اور چھوٹی چھوٹی نظمیں بہت ضروری ہوتی ہیں جنکو بچے چلتے پھرتے یاد کرلیں- کچھ کہانیوں میں بعض الفاظ اور جملوں کی تکرار ہوتی ہے- بچے ان کہانیوں کو سن سن کر خود بھی انکو دہرانے لگتے ہیں اور اسطرح انکی زبان کھلنے لگتی ہے، انکا تلفظ صحیح ہونے لگتا ہے اور انکے بیان میں روانی آجاتی ہے- لوری کا تجربہ بچے کو لئے اور آہنگ سے متعارف کرواتا ہے اور موسیقی کا یہ ابتدائی تجربہ یہیں ختم نہیں ہوجانا چاہئے بلکہ اسکا سلسلہ ساری زندگی چلنا چاہئے مخصوصاً لڑکپن کے زمانے میں، جب دل و دماغ بیرونی اثرات جلد قبول کرتے ہیں- موسیقی کا تعلق راست زبان کے تجربے سے ہوتا ہے اور گیت بچے کو اسکے شعری اور ادبی ورثہ تک پہنچنے کے لئے تیار کرتے ہیں-

بول چال کی متذکرہ بالا بنیادی شرائط کے پورا ہونے کے ساتھ ہی ساتھ بہت کم عمری میں بچے کی لکھنے پڑھنے کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے مواقع فراہم کرنا چاہیئں - سوا سال یا ڈیڑھ سال کی عمر کے بچے کو قلم یا پنسل پکڑنے کا اہم فن آ جانا چاہئے - جب اسکو کاغذ پر تصویریں بنانے کا موقع دیا جاتا ہے تو اس کے ہاتھوں کی motor skills یعنی حَرَکی صلاحیتوں میں اضافہ ہونے لگتا ہے اور آگے چل کر جب وہ ٹیڑھی ترچھی لکیریں کھینچنے لگتا ہے اور پھر بڑوں کی دیکھا دیکھی جھوٹ موٹ کی لکھت کرنے لگتا ہے تو یوں گویا اسکی literacy skills یا لکھت کی صلاحیتوں کی نشوءنما ہونے لگتی ہے - اس دور کو بچے کی emergent handwriting کا دور کہتے ہیں - ہمارے روائیتی تعلیمی طریقوں میں بچے کو بسا اوقات چھ سات سال کی عمر تک آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا اور پھر ایک دن اسکو پکڑ دھکڑ کر استاد کے حوالے کر دیا جاتا تھا جو مار پیٹ کا عمل شروع کر دیتا تھا - آج بھی یہ ہوتا ہے کہ بچے کی مرضی کو تعلیمی عمل میں شامل کرنے کے سلسلے کو ایجاد کئے بغیر اسکو پانچ یا چھ سال کی عمر میں کمیونٹی کے مراکز میں ایسے لوگوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو نہ صرف تعلیمی نظام سے خود دور رہے ہیں بلکہ جنکے تدریسی طریقے بچوں کی صلاحیتوں اور شخصیتوں پر نہایت منفی اثر ڈالتے ہیں - کچھ تعجب نہیں کہ اکثر بچے اس ناقص اور ناسمجھ نظام کا شکار ہو کر رہ جاتے تھے - اب اس نئے دور میں جبکہ نہ صرف تعلیمی افکار کے بارے میں ہماری معلومات بہت بہتر ہیں اور تعلیمی اور الکٹرونک لوازمات بھی فراہم ہیں، ہم کو اپنی زبانوں کی ترویج اور بقا کے سلسلے میں زیادہ ذہانت سے کام لینا چاہئے -

جن گھروں میں زبان کا صحیح چلن ہو بھی جائے وہاں اگر ثقافت کا وسیع تر ماحول غیر حاضر ہو تو زبان کا تجربہ ناقص اور خام رہ جاتا ہے - بچے اس ماحول سے نکل کر اکثر دنیا کی بازی جیتنے میں ناکام رہتے ہیں اور کسی بھی قوم کے تقدیر ساز افراد نہیں بن سکتے - مغرب میں ہماری مہاجر نسلوں نے شناخت کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے گھروں کے ماحول کی اہمیت کو سمجھے بغیر مذہبی اداروں میں کچی پکی دینی تعلیم کا سہارا لیا ہے اور پاکستان اور ہندوستان سے ملا اور مولوی دھڑا دھڑ منگائے جا رہے ہیں - بسا اوقات ان لوگوں کے ذمہ علاوہ دینی تعلیم کے زبان کی تعلیم بھی کر دی جاتی ہے جیسے کہ برطانیہ کے مختلف شہروں میں ہو رہا ہے - یہ لوگ مذہب کے نام پر وہ ماحول ایجاد کر رہے ہیں جہاں موسیقی، شعر و فن، ہنر اور زبان کے سیکیولر یعنی غیر مذہبی ادبی ورثہ وغیرہ کا نہ صرف ذکر نہیں ہے بلکہ اس سے لاتعلقی اور اجتناب کا وہ سلسلہ قائم ہو رہا ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ ثقافت اور زبان سے لابلد نسلیں ایجاد کر رہا ہے - یہ کوئی نئی بات نہیں ہے - اسلام کے 'دینی رہنماؤں' نے ہمیشہ ہی ان چیزوں سے کنارا کیا ہے جو انسانوں کے دل و دماغ کی کھڑکیاں کھولتی ہیں اور جنکے باعث ملاؤں کی اسلامی معاشروں میں اجارہ داری کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے - یہ تبلیغی نظام نہ صرف زبان کی پُر اثر ترویج میں شدت سے ناکام ہے بلکہ اس عمل نے نوجوانوں کی ایسی بدذوق اور کوری نسلیں ایجاد کی ہیں جو کلچر نام کی ہر چیز سے بے تعلق اور بے بہرہ ہیں اور جنکے ثقافتی اجتناب و افلاس کے بطن میں انکی قومی اور لسانی بھول کے بیج پیوست ہیں -

ع زیدی

20 ستمبر 2000 - انگلتان

Revised 4 January 2008

بنیادِ زبان

علیشان زیدی

Alishan Zaidi